بیگانی

Bachchon Ka Kutab Khana
Mohl- Thana Tla
Rampur U.P.

[illegible]

ں کا بک ڈپو - دہلی

بی سیدانی

٦٦٧

از

اشرف صبوحی صاحب دہلوی

بچوں کا بک ڈپو، کلاں محل دہلی

قیمت ۳ر

بسم اللہ

۷۸۶

بچّوں سے

یہ کہانی بھوتی صاحب کی نئی کتاب "دِلّی کی چند عجیب ہستیاں" میں چھپی ہے یہ کتاب انجمن ترقی اُردو ہند، دہلی نے شائع کی ہے انجمن نے بڑوں کے لئے بہتیری بڑھیا بڑھیا کتابیں نکالی ہیں، یہ کتاب بھی گویا بڑوں کے لئے ہے۔ مگر یہ کہانیاں جو ہم نے پڑھیں تو خیال ہوا کہ بچّوں کے لئے بھی خوب رہیں گی۔

آپ جانیں آپ کی خاطر ہم پر تو جیسے دُھن سوار رہتی ہے کہ آپ کی کوئی کوئی چیز ہاتھ لگے اور آپ تک اُسے پہنچائیں۔ یعنی کہانیاں تو آج کل سیر کی ماری ڈھیر

ملتی ہیں کوئی کمی نہیں، مگر اُن میں بھرتی کی چیزیں زیادہ ہیں، اچھی اور کام کی چیزوں کی سچ مچ بہت کمی ہے۔

بس تو ہم نے انجمن کے معتمدِ اعزازی "بابائے اُردو" عالی جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق مدظلہٗ سے درخواست کی

مولوی صاحب قبلہ کا سایا ہم پر اور ہماری زبان پر تادیر سلامت رہے، وہ "پُرانے خاک نشینوں کی یادگار" اُن جیسے بے لاگ، بے لوث بزرگ، اور کام کرنے میں جوانوں کو شرمانے والے بڑے بوڑھے اب کاہے کو پیدا ہوں گے، دِن رات کام کے پیچھے دیوانے، اور دوسرے کام کرنے والوں کے بھی سچّے ہمدرد اور مُربّی، تبھی تو اُنھوں نے فوراً اجازت نامہ بھیج دیا جو آپ آگے دیکھیں گے۔

آپ کا خادم
مجیب

نقل مطابق اصل

مکتوبِ گرامی عالی جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق مدظلہٗ

عزیزی مجیبی صاحب سلمہٗ

آپ کا خط پہنچا۔ انجمن کی کتاب "دِلی کی چند عجیب ہستیاں"
میں سے جن دو کہانیوں کے شائع کرنے کی اجازت آپ نے طلب کی ہے
اس کی اجازت میں صرف اس بنا پر دیتا ہوں کہ آپ بچوں کے لئے
بہت اچھی اور مفید کتابیں شائع کر رہے ہیں، اردو ادب میں
اس کی بڑی کمی ہے۔ میں آپ کی اس خدمت کو بڑی قدر کی نظر سے
دیکھتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کی یہ سعی مشکور ہوگی۔

۱۔ دریا گنج، دہلی
۹ر اگست ۱۹۴۵ء

خیر طلب
عبدالحق

سلہ بی سیدانی اور پرنانی

بی سیدانی

سیدانی بی کا ایک وقت میں بڑا دور دورہ تھا قلعے کی اچھی اچھی مُغلانیاں اُن کے سامنے کان پکڑتی تھیں۔ محلات میں جہاں کوئی نیا جوڑا سِلا، کسی نئی وضع کی ٹکائی کا ذکر ہوا اور یہ بُلائی گئیں، شہر کی بیگمات میں بھی ان کے ہنر کی دھاک تھی۔ سب انھیں آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ آج پالکی چلی آرہی ہے کہ بڑی سرکار نے بُلایا ہے، کل ڈولی کھڑی ہوئی ہے کہ نواب سُلطان جہاں بیگم نے یاد کیا ہے، نہ رات کو فرصت، نہ دِن کو چین، صبح کو کہیں مہمان ہیں تو شام کو کہیں

لیکن رہے نام سائیں کا، ہاتھ پاؤں نے جواب دے دیے، آنکھیں دھندلا گئیں، اب کون پوچھتا۔ دنیا اور مطلب، مطلب نہ رہا تو کیسی خاطرداری؟ ہارے وقت کا کوئی ساتھی نہیں، بے چاری کو ٹکڑے کا سہارا دینے والا بھی کوئی نہ تھا۔ جب بہت پریشان ہوئیں تو پڑوس میں ایک میر صاحب رہتے تھے، اُن کی بیوی نے انھیں ترس کھا کر اپنے ہاں رکھ لیا۔

سُنا ہے کہ یہ نہایت شریف گھرانے کی بیٹی تھیں۔ مرہٹہ گردی میں ان کا خاندان تباہ ہو گیا، برس دن کی بیاہی بیوہ ہو گئیں۔ اُس زمانے میں دوسری شادی کرنا بڑا عیب سمجھا جاتا تھا، مغلانی کا پیشہ اختیار کر لیا اور اپنی ہنرمندی کی بدولت رنڈاپا گزار دیا۔ جوانی تو عزت و آبرو سے کٹ گئی خوب کمایا، ہزاروں

رڈی انعام میں ملے مگر رکھنا نہ جانا، دل کی جائم اور طبیعت کی نرم تھیں، اِدھر آیا اور اُدھر لٹا دیا، اپنا انجام کبھی نہ سوچا، ہنرمندوں اور پرانے شریفوں میں ایک یہی عیب ہوتا ہے کہ وہ وقت کی قدر نہیں کرتے خدا کی بے نیازی کو بھول جاتے ہیں۔ بنے ہوئے زمانے میں بگڑنے کا خیال بھی نہیں آتا۔ جانتے ہیں کہ سدا یہی لہر بہر رہے گی۔ سیدانی بی بھی جوانی بھر اسی بھول کا شکار رہیں۔ بڑھاپے نے آن دبایا، طاقتیں دغا دے گئیں تو آنکھیں کھلیں اور دوسروں کے سہارے پر زندگی کے اندھیرے دن پورے کرنے پڑے۔

Bachchon Ka Kutab Khana,
Moh:- Thana Tin
Rampur U.P.

میر صاحب کے گھر والے چھوٹے سے بڑے تک سب کے سب انتہا سے زیادہ خوش مزاج، نیک دل

اور خدا ترس تھے، ہر ایک سیدانی بی کو خدا کا بھیجا ہوا مہمان سمجھ کر اُن کے آگے بچھا جاتا تھا، سیدانی بی دو چار روز تو ذرا گھبرائیں اور شرمندہ سی رہیں۔ پھر اُن کا بھی دل کُھل گیا اور اس طرح رہنے لگیں جیسے اپنے کنبے ہیں۔ ہاتھ کانپتے تھے، نگاہ موٹی ہو گئی تھی، سوئی کا ناکا مشکل سے سوجھتا تھا، لیکن ساری عمر محنت کر کے کھایا تھا، پرائی روٹی مُفت کیسے کھا سکتی تھیں۔ صبح نماز پڑھ کر بچوں کو لے بیٹھیں، قرآن شریف پڑھاتیں، نصیحتیں کیا کرتیں۔ دوپہر کو سینا پرونا، کاڑھنا سکھاتیں، شام ہوتی تو باورچی خانے میں جا کر کھانا پکانے کی ترکیبیں بتاتیں، رات آتی عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر بڑے مزے کی کہانیاں سُناتیں، کہانیاں ایسی اچھی ہوتیں کہ بڑے بھی آجاتے۔ میر صاحب اور اُن کی بیوی دونو

خوش تھے کہ سیدانی بی کو بچوں کی تربیت کے لئے
خدا نے بھیج دیا، ایسی شریف، روزہ نماز کی پابند
ہنرمند اُستانی صرف روٹیوں پر کہاں میسّر
آتی ہے۔ اور بچے ایسے گرویدہ کہ دن رات
سیدانی کے پاس بیٹھے رہتے۔
مشہور تھا کہ سیدانی بی پرستان میں بھی
ہو آئی ہیں، وہاں کے بادشاہ نے اپنی بیٹی کا
جہیز ٹانکنے کو بلایا تھا، اور اُنھوں نے وہاں
دنوں رہ کر بڑے بڑے تماشے دیکھے ہیں، گھر
والوں کو یہ خبر تھی لیکن کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ
بی سیدانی سے پوچھتے تو کہ کیا بی سچ مچ تم پرستان
گئی ہو، شاباش تمھارا جگرا کہ تم کو ڈر نہیں لگا۔
ایک دن سردیوں کی رات تھی، دالانوں سے کے

پڑے پڑے ہوئے تھے، چھوٹے بچّے لحافوں میں دبکے اور بڑے لڑکے لڑکیاں انگیٹھی کے چاروں طرف بیٹھی کہانی سُن رہی تھیں کہ اتنے میں میر صاحب کی بیوی نماز، وظیفے سے فارغ ہوکر آئیں اتفاق سے کہانی بھی انڈا شہزادی کی تھی، جب یہ ذکر آیا کہ کالے دیو کی جو شہزادی پر نظر پڑی تو سوتی کو پلنگ سمیت اُڑا کر لے گیا، میر صاحب کی بیوی کہنے لگیں: سیدانی بی یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ تمھیں بھی پرستان کے بادشاہ کا کوئی آدمی پرستان لے گیا تھا اور تم وہاں سے بڑا انعام و اکرام لائی تھیں۔ کیا سچ ہے؟

سیدانی: ہاں بیوی ہے تو سچ، ملکہ پری دخترِ ... شہپر نے مجھے بلایا تھا

میر صاحب کی بیوی :- اوئی اور تم بے دھڑک
چلی گئیں!

سیدانی :- پہلی دفعہ تو مجھے دھوکے سے لے
گئے تھے۔ رستے میں جب بھید کھلا تو بہتیری
ڈری، لیکن کیا کرتی۔ دل کو مضبوط کر لیا اللہ
کو یاد کرتی چلی گئی، پر جاتی یا روتی بیٹھتی تو جانے
کیا آفت آتی۔ اس کے بعد جب گئی ہنسی خوشی
گئی اور ہنسی خوشی آئی۔ بیگم صدقے اپنے رسولؐ
کے، اس پر ایمان رکھنے والے کا کہیں بال بیکا نہیں
ہوتا۔ پر سچ بتاتی ہوں بی، میری تو خاطریں ہوئیں
کہ کیا کہوں۔

میر صاحب کی بیوی :- کچھ بھی سہی بوا میرا تو
زہرہ پھٹ جاتا، صورت دیکھتے ہی جان منہ ہے

نکل جاتی ۔

سیدانی ۔ نہیں بی یہ سب کہنے کی باتیں ہیں، ڈر
کی باتوں سے ڈر لگا کرتا ہے جب ڈر سامنے
آیا پھر کچھ بھی نہیں ۔ دیکھو بیماری سے لوگ
کتنا گھبراتے ہیں اور جب بڑے سے بڑا دکھ
بھی آجاتا ہے تو سہنا ہی پڑتا ہے ۔

میر صاحب کی بیوی ۔ ہاں تو پھر یہی کہوں گی کہ
ذکو شاباش ہے ۔ صد رحمت اس پر جس نے ٹھہرا
[illegible] بھی تو سمجھ کے کہہ [illegible]
تھا، کھولنا گئی [illegible]
کیا کیا دیکھا ؟

سیدانی : [illegible]
[illegible] گتا ہے [illegible] ان کی [illegible]

جو ڑا ٹانکنے گئی تھی بہت بسر ہوئی، دوسری پریوں نے بھی منتیں کیں کہ "سیدانی اماں یہیں رہ جاؤ، دُنیا میں اب تمہارا کون ہے" مگر میں نے ایک نہ مانی۔ مجھ بدنصیب کو تو اپنے جیسے انسانوں کی بے مروتیاں دیکھنی تھیں، پریشان ہیں کیوں بستی! وہ تو اللہ نے تمہارے دل میں رحم ڈال دیا جو گور گڑھے کا ٹھکانا ہو گیا، ورنہ تیرے میرے دروازوں کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی۔

میر صاحب کی بیوی۔ سیدانی بی سب اللہ کے ہاتھ میں ہے، بندے میں کیا طاقت ہے کہ بھوکے کو دے یا پیٹ بھرے سے چھینے۔ ہر ایک اپنی تقدیر کا کھاتا ہے۔ ہماری کیا اصل ہے کہ کسی کے ساتھ کوئی سلوک کریں، وہ تو زبردستی ہم سے

تمھاری خدمت کر رہا ہے۔

سیدانی: خیر تو اب تم کو اپنی بپتی کہانی سُناؤں۔ بیگم یہ وہ دن تھے کہ نواب اعظم الدولہ بہادر کی اکلوتی بیٹی کے بیاہ کی تیاری ہو رہی تھی، ہزار ہا جوڑے سِل رہے تھے، اوّل اوّل تو مجھے رات دن وہیں رہنا پڑا۔ کام ہلکا ہو گیا تو دن کو چلی جاتی اور شام کو اپنے گھر چلی آتی۔ ایک روز جیسے بچے مکتب سے بھاگتے ہیں میرا بھی جانے کو جی نہ چاہا، اور کئی جگہ سے بلاوے آئے نہ گئی۔ شاید جمعہ تھا، کئی ہی دن نہائے کو ہو گئے تھے، خوب نہائی، شام ہو گئی۔ بونٹ پلاؤ مجھے بہت بھاتا ہے، ماما سے بونٹ پلاؤ پکوایا تھا

تھکی تھکائی لیٹی تھی، اِتنے میں جھٹپٹا ہوگیا۔ پلاؤ دَم پر تھا کہ باہر سے کسی نے آواز دی کہ "سیدانی بی کو سرکار نے یاد کیا ہے، پینس بھیجی اور کہا ہے کہ جس طرح بیٹھی ہو اُسی طرح فوراً چلی آؤ۔" میں بڑے نخروں سے جایا کرتی تھی، ایسے بے وقت اور اپنے بھاؤن کی پکوائی ہوئی چیز چھوڑ کر کھڑے ہو جانا میری عادت کے بالکل خلاف تھا۔ لیکن ہونے والی بات میں نے ذرا انکار نہ کیا، اور جیسی بیٹھی تھی سفید چادر سر پر ڈال سوار ہو گئی۔ نواب صاحب کا محل میرے گھر سے کوئی دو آنے ڈولی ہوگا۔ قاضی واڑے سے نکلے اور خانم کا بازار آیا۔ پہلے تو مجھے کچھ خیال نہیں ہُوا، جب بہت دیر ہو گئی اور ہٹو بچو کی آواز

نہ آئی، بازار کے چراغ بھی جھلکتے ہوئے نہ دکھائی دیئے تو پردے کی جھری کھولی۔ اب جو دیکھتی ہوں تو جنگل سائیں سائیں کر رہا ہے، اور پینس کو جیسے پہیے لگے ہوئے ہیں، اُڑی چلی جا رہی ہے، بدن میں سنسنیاں آنے لگیں، ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے، کہ یہ کیا غضب ہوا، یہ موئے کہار کہاں لے بھاگتے ہیں۔ اس جنگل میں کون سی سرکار ہے۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا دل کڑا کر کے میں نے اپنی آواز نکالی اور پوچھا: ارے کم بختو! منہ سے تو پھوٹو مجھے کہاں لے جاؤ گے، ارے وہ تمھاری کون سی ستیاناسی سرکار ہے! "سنتے ہوئے کسی نے جواب دیا۔" بدائی جی خفا کیوں ہوتی ہو بادشاہ سلامت نے بلایا ہے۔

کوئی دم میں محلات دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی پالکی کے پاس بول رہا ہے، منھ نکال کر جو دیکھا تو بیگم کیا کہوں ایک ہیجّا[1] کی شکل کا آدمی تھا بکرے کا سا سر، گھوڑے کی سی ٹانگیں اور پالکی آپ ہی آپ چلی جاتی تھی، نہ کہار تھے نہ کہاریاں اب تو ڈر کے مارے میرا دم گھٹنے لگا، آنکھیں بند کرلیں اور کلمہ پڑھنے لگیں کہ اس بلا نے کھایا ڈھیر ہو کر رہ گئی۔ منٹ دو منٹ کے بعد پھر ہمت کی کہ اوّل مرنا آخر مرنا پھر مرنے سے کیا ڈرنا۔ اور للکار کر بولی: ارے جوانا مرگ تو کون ہے جن ہے یا بھوت؟ یاد رکھ میں سیدانی ہوں مجھے نہ ستانا نہیں تو جل کر خاک ہوجائے گا

---

[1] ایک ڈراؤنی صورت بچوں کو ڈرانے کے لئے جیّا۔

(بی سیدانی)

بھلا چاہتا ہے تو مجھے یہیں اُتار دے۔

اُس نے کہا: سیدانی بی گھبراؤ نہیں ہم اور ہمارے بادشاہ سیدوں کو بہت مانتے ہیں۔ خاطر جمع رکھو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ہماری شہزادی کی شادی ہے۔ کپڑے سی کر چلی آنا۔ جتنا مانگو گی انعام ملے گا۔ لو وہ دیکھو سامنے ہمارے بادشاہ کا محل ہے۔

بڑی مشکل سے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول کر جو دیکھا تو واقعی پایا ایک عالی شان دروازے پر کھڑی ہے، روشنی ایسی تھی کہ دن معلوم ہوتا تھا۔ سوئی گر پڑے تو اُٹھا لو اور مزہ یہ کہ نہ سورج تھا نہ چاند۔ نہ فانوس کہیں نظر آتے تھے نہ لال ٹین۔ چوب دار، باری دار مرجے

اِدھر سے اُدھر دوڑ رہے ہیں، آسمان پر
سے عجب عجب طرح کے باجوں کی آوازیں
آرہی تھیں ۔

یہ تماشا دیکھ کر میں ساری مصیبت بھول
گئی، میں حیران تھی کہ یہ کس بادشاہ کا محل ہے،
یہ گہما گہمی تو ہمارے بادشاہ کے یہاں بھی
نہیں ہوتی کہ قصے کہانیوں میں جیسے پریوں
کا ذکر سنا ہے ایسی ایک پری شانوں
پر بال بکھرے ہوئے، بازوؤں پر پر
میرے پاس آئی اور مہین آواز میں بولی:
"سیدانی بی! بڑی راہ دکھائی، ہمارے
بادشاہ اور بادشاہ بیگم کب سے تمھارا
انتظار کر رہے ہیں، آؤ چلو میں تم کو محل کے

اندر لے چلوں۔"

میں پالکی سے اتری اور چادر کو اچھی طرح اوڑھ کے اس پری کے ساتھ ساتھ چلی، کیا کہوں اندر کیا بہار تھی، ہزاروں پریاں، گورے گورے رنگ، بوٹا سے قد، زرق برق کپڑے، ہنستی چہلیں کرتی، اٹھکیلی پھر رہی تھیں۔ چمن ایسا کہ دیکھا نہ سنا، ہر درخت کا تنا چاندی کا، سونے کی شاخیں، زمرد کے پتے۔ پھلوں کی جگہ کہیں لال لٹک رہے تھے، کہیں نیلم پکھراج، پھولوں پر یہ عالم تھا جیسے ہیرے چمک رہے ہوں، کلیاں تھیں کہ صراحی دار موتی، خوش بو سے دماغ مہکا جاتا تھا،

حوضوں کا پانی اللہ اللہ، چاندی کے ورق بکھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ فوّاروں میں سے موتیوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔

چلتے چلتے ایک بارہ دری میں پہنچے بارہ دری کی سجاوٹ کیا بیان کروں، قلعے کے دربار بھی دیکھے ہیں، مگر اُس جیسا سماں آج تک نظر سے نہیں گزرا۔ سیکڑوں سُرخ، سبز، نیلی، زرد، اودی، سفید کرسیاں بچھی تھیں۔ رنگ برنگ کے بلّور کی تھیں، یا کسی اور چیز کی ایسی شفّاف کہ آر پار نگاہ گزر جاتی تھی۔ اور اُن پہ حسین حسین پری زاد جگمگاتے لباس پہنے

بڑے ٹھسّے سے بیٹھے تھے ۔ بیچ میں ایک
نم گیرے کے نیچے ایک بڑے یاقوت کے
تخت پر جس میں ہیرے اور پنّے کی پچّی کاری
کا کام تھا ، بادشاہ اور بادشاہ بیگم عجیب
شان سے بیٹھے ہوئے تھے ۔ بادشاہ بیگم کے
پہلو میں ایک لڑکی کوئی چودہ پندرہ برس کی
چہرہ جیسے چودھویں رات کا چاند ۔ زلفیں
کھلی ہوئی ۔ کئی رنگ کے پَر اور ایسے چمک دار
کہ آنکھ نہیں ٹھیرتی تھی ، سر پر نیم تاج رکھے
بیٹھی تھی ۔ اِن تینوں کی پوشاکیں ایک
رنگ کی ہوں تو بتاؤں ، گھڑی ہی میں چار
چار رنگ بدلتی تھیں ۔

مِنّی آگے بڑھ تو رہی تھی مگر ہاتھ پاؤں

کانپ رہے تھے۔ ڈر سے نہیں حیرانی سے کہ یا اللہ یہ کون لوگ ہیں، میں جاگ رہی ہوں یا خواب میں یہ پرستان کی سیر ہے۔ اور اگر جاگتے میں کوئی پری یا دیو مجھے یہاں اُڑا لایا ہے، تو دیکھئے گھر اُلٹا جانا بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ اسی سوچ میں تخت کے پاس پہنچ گئی، بادشاہ میری گھبراہٹ دیکھ کر مسکرائے، اور بادشاہ بیگم نے مجھ سے کہا: "آؤ سیدانی بی آؤ۔ مزاج تو اچھا ہے ہم نے سُنا کہ رستے میں تم بہت ڈریں۔"

سیدانی۔ حضور کو دُعا دیتی ہوں، سرکار ڈرنا کیسا، وہ تو مولیٰ علیؑ مشکل کشا نے مدد کی، نہیں تو جان نکلنے میں کسر ہی کیا رہی تھی۔" صدقہ مولا

کے، نام آتے ہی بادشاہ اور سارے درباری
سرو قد کھڑے ہو گئے، اور بادشاہ فرمانے
لگے۔ "شیدانی بی! تم جانتی ہو ہمارے
یہاں اِس نام کی کتنی عزت ہے، سینکڑوں
برس ہوئے اِنہی حضرت کے ہاتھ پر ہمارے
بزرگ اسلام لائے تھے۔" میں نے دِل میں
خدا کا شکر ادا کیا کہ جو کچھ بھی ہو یہ لوگ ہیں
مسلمان، اور اب کسی بات کا ڈر نہیں۔
بادشاہ بیگم۔ ہم کو گنہ گار نہ کرو (ایک کرسی کی
طرف اشارہ کرکے بولیں) بیٹھ جاؤ ہاں تم
ڈرتی کیوں تھیں؟

میں نے کہا: "سرکار ڈرنے کی بات کیوں
نہ تھی، ایک اکیلی، دوسرے سنسان جنگل، پھر

جو میرے ساتھ تھا اُس کی صورت ایسی ڈراؤنی تھی کہ میرے اوسان جاتے رہے۔"

یہ سُن کر شہزادی خوب ہنسی اور بولی: "امّاں بیگم، بکر گدھا مُوا بڑا شریر ہے، اُس نے کہیں اپنی شکل دکھا دی ہو گی۔"

اب میرے پیٹ میں بھی ہول اُٹھنے لگی کہ کہیں یہ ساری صورتیں بھی نقلی نہ ہوں اور بولا بولا کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ بادشاہ بیگم سمجھ گئیں کہ شہزادی کی باتوں سے سیدانی کے دل میں ہماری صورتوں کی طرف سے کچھ شبہ ہو گیا ہے۔ وہ مسکرا کر بولیں: "سیدانی بی! ڈرو نہیں، ہماری سب کی شکلیں اصلی ہیں، بلکہ پری زادوں کی ساری ایسی ہی خوب صورت

شکلیں ہیں، جیسی تم دیکھ رہی ہو۔ میری
لڑکی (سہیل پری) نے جس کا ذکر کیا وہ جن ہے
اور جن البتہ وضع وضع کی شکلوں کے ہوتے ہیں
خاطر جمع رکھو، تمھارے سامنے کوئی جن یا دیو
بری صورت بنا کر نہیں آئے گا۔"

اتنے میں کھانے کے خوان آنے لگے،
خاصہ چنا گیا، کھانا کیا تھا اللہ کی قدرت کا
کرشمہ تھا، ایک ایک بالشت کے پودے
پھل، پھولوں سے لدے ہوئے سامنے
تھے۔ خوش بو کی لپٹیں آرہی تھیں، مگر میں
کھاتی کیا، نہ کسی قسم کی روٹی تھی نہ سالن،
نہ پلاؤ تھا نہ زردہ، ہکا بکا ایک ایک
کا منھ دیکھتی رہی کہ بادشاہ بیگم مسکرا کر بولیں

"سیدانی بی! دیکھتی کیا ہو، کھاتی کیوں نہیں؟"
یہ پرستان کا کھانا ہے۔ تم مہمان ہو، ہاتھ بڑھاؤ
تو اور بھی کھائیں۔

میں نے کہا: "سرکار کوئی کھانے کی چیز ہو تو
کھاؤں، یہ تو تھوڑے درخت ہیں اور ان میں
جو پھل پھول لگے ہیں وہ بھی اللہ مارے سچ مچ
کے نہیں دکھائی دیتے۔"

شہزادی الآڈہ اُس نے میرے اس کہنے
پر ایک فرمائشی قہقہہ لگایا اور کہنے لگی، "سیدانی بی! جیسا
سُنا تھا کہ آدم زاد بڑا بھولا ہوتا ہے، تمھیں ویسا ہی
پایا۔ تم بسم اللہ کر کے کوئی پھل توڑ دو اور کھا دو۔
جس کھانے کا خیال کرو گی وہی مزہ آئے گا۔"

بیگم یقین مانو ایک زرد زرد جو پھل توڑ کر میں

سے منہ میں رکھا، کیا کہوں دِلّی میں تو کسی نے ایسے
ذائقہ کا بونٹ پلاؤ کھایا نہ ہوگا۔

میر صاحب کی بیوی۔ بونٹ پلاؤ جو گھر میں چھوڑ کر
گئی تھیں وہی پہلے یاد آیا۔

بڑی لڑکی سطحے میں تو آپ بہت جایا کرتی ہیں کیا وہاں بھی
کبھی ایسے مزے کا نہیں کھایا۔؟

سیدانی۔ جیسی بادشاہ کے خاص رکاب دار سے بادشاہت کے
بڑے بڑے تخریعی کھانے بیسیوں مرتبہ بھی نہ کھائے
ہوں گے، مگر بیوی وہ بوباس اور وہ آب و نمک
ہی کچھ اور تھا۔ ہاں تو بہن پھر کیا تھا جو جو کھانے
کھاتے تھے، بلکہ جن کا نام ہی سُنا تھا اُن کا
خیال کرتی گئی اور ایسے ہی شان، وہی مزہ
آتا گیا، اچنبے کی بات تھی کہ جب ایک کھیل توڑتی

دوسرا اس کی جگہ فوراً نکل آتا، پھولوں کلیوں
کو چکھا، مٹھائیاں تھیں، ایسی ایسی نفیس
ہلکی خوش ذائقہ کہ ہر نوالہ میں رُوح تازہ ہوتی
چلی جاتی تھی، پیاس معلوم ہوئی تو پانی کا خیال آتے
ہی دیکھا کہ یاقوت کا گلاس خود بخود آکر منھ سے لگ
گیا۔ یاقوت کا گلاس اور ایسا شفاف کہ باہر سے
پانی جھم جھم کرتا دکھائی دیتا تھا۔ ڈر کے مارے
میں نے زور سے ہونٹ بھی نہیں کھینچے کہ کہیں
کنارہ ٹوٹ کر منھ میں نہ چُبھ جائے۔ اللہ اللہ
پانی کو نہ پوچھو، نہ میٹھا ایسا معطّر ایسا سفید پانی
تو نہیں ہوتا! نہ جانے کیا چیز تھی۔ سب سے
پہلے میں نے سوچا کہ پتوں کو بھی دیکھنا چاہئے
ساتھ ہی پان کا بھی خیال آیا۔ میں پان کا بڑا

بہت کم کھاتی ہوں، لیکن کھانا کھا کر دو وقت تھوڑا سا پان کھانے کی عادت ہے۔ اب جو پتا توڑتی ہوں تو پان کی خوشبو، منہ میں جو رکھا تو بس معلوم ہوا کہ عطردان میں رکھی ہوئی گلوریاں کلے میں آ گئیں، کہتے ہیں محمد شاہ رنگیلے کی کوکلتاش جیسا پان کھاتی تھی، لال قلعے میں تو اس سے پہلے کسی کو نصیب ہوا نہیں، مگر میں کہتی ہوں کہ اگر پرستان سے اس پتے کو ایک دفعہ صرف سونگھ لیتی تو ساری عمر سر دھنتی رہتی، مشک و عنبر پڑے ہوئے کتھے اور سچے موتی کے چونے کا پان بھی اس کے آگے بے حقیقت ہے۔ جب سانس لیتی تھی نئے سے نئی خوشبو کی لپٹیں آتی تھیں۔

اب بادشاہ بیگم نے جن کا نام زمرد پری تھا تو شہر خانے والیوں کو حکم دیا کہ شاہزادی

کے کپڑے لاؤ، کشتیوں پر کشتیاں اور تھان پر تھان آنے لگے، کپڑوں اور گوٹہ کناری کو دیکھ کر میری تو عقل جاتی رہی۔ بڑی بڑی رانیوں شہزادیوں کے جوڑے دیکھے ہیں۔ نور بائی کی پشواز بھی دیکھی ہے جس میں سیروں جواہرات ٹکے ہوئے تھے لیکن ان کپڑوں سے کیا نسبت، کجا دنیا کے کپڑے کجا پرستان کے، آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی، ریشم اور سونے کے تاروں سے بنی ہوئی آبِ رواں، موتیوں سے ریسی ہوئی گلشن، ایسا ہی کم خواب اور زربفت کہ دیدہ نہ شنید گوٹا وہ کہ دنیا دیکھے اور عش عش کرے، رنگ برنگ کے جواہرات کی لڑیاں تھیں۔

جب سامان آگیا تو بادشاہ بیگم بولیں "لو بی سیدانی! اب تم اپنا ہنر دکھاؤ، بہت تمہارے ہی

تعریف سنی ہے، ہم تو جب جانیں کہ پرستان میں بھی
تمھارا نام ہو جائے۔"

میں بولی، میں تو بہت پشیمان ہوئی کہ یا اللہ میں
یہاں کیا کاریگری دکھاؤں، کون سی وضع ٹانکوں
کہ ان کے لیے نئی ہو۔ مگر زبان سے کہا "حضور! اللہ
مالک ہے، وہی آبرو رکھنے والا ہے، صبح ہونے دیجیے
جو کچھ مجھے آتا ہے حاضر ہوں۔"

وہ ہنس کر بولیں: "سیدانی بی! پرستان میں نہ دن
ہوتا ہے نہ رات، ایک ہی موسم اور ایک ہی وقت رہتا
ہے۔ [illegible] شروع کر دو۔"

[illegible]

ہیں نہیں آتی، ہمارا مشغلہ تو آٹھوں پہر سیر تماشے
ہیں، پرستان سے جی اُکتایا تو دُنیا والوں کی
خوابوں میں چلے گئے۔"

بہن میں نے دیکھا کہ نیند کا نام بھی آنکھوں
میں نہیں۔ نہ پیٹ میں گرانی نہ سر بھاری
نہ انگڑائیاں نہ جمائیاں، سوچا کہ دیر کیوں لگاؤں، کتر
بیونت کا سامان تو موجود ہی تھا، اللہ کا نام لے جوڑے
بیونتنے لگی اور اُسی وقت سے سینے کترنے کا دھندا لگا دیا
اِدھر میں ایک طرف بیٹھی ہوئی اپنے کام میں معروف
تھی اور اُدھر ناچنے گانے والی پریوں کے تخت اُتر رہے
تھے، ایک سے ایک طرح دار، ایک سے ایک شوخ
اپنے فن میں اُستاد، نہ کانوں نے کبھی ایسا گانا سُنا
تھا، نہ آنکھوں نے ایسے ناچ دیکھے تھے، آوازیں

(بی سیدانی)

بھتیں کہ جیسے کوئلیں رِل کر کوکیں ، ناچ تھا کہ
ہوائیں جیسے تیتریاں اُڑ رہی ہیں۔ کیا پوچھتی ہو بیگم!
خُدا کی قدرت کا تماشا تھا۔ لیکن مجھے تو اپنی فکر تھی
کہ کہیں جلدی کام نبٹے، اور چھٹکارا پا کر اپنے گھر
جاؤں ، ذرا کے ذرا آنکھ اُٹھا کر دیکھ لیتی ، اور
پھر اپنی سوئی چلانے لگتی۔
اُس کارساز کی کارسازی کے قُربان صدقے
اپنے مُشکل کُشا کے، عقل نے ایسا کام دیا کہ پہلے
ہی جوڑے میں واہ واہ ہوگئی، شہزادی کا چہرہ بھی
خوشی کے مارے پھول کی طرح کھِل گیا، اب کیا تھا!
میرے ہاتھ میں گھوڑے لگ گئے، دِنوں کا کام
گھڑیوں میں ہونے لگا۔
کہانی تو بہت لمبی ہے، کہاں تک کہوں، جس

کام کی آدمی دُھن باندھ لے، وہ ہو ہی جاتا ہے،
آخر سارے جوڑے سِل بھی گئے اور ٹنک بھی گئے،
کیتنے دِن لگے یہ کون کہہ سکتا ہے، وہاں دِنوں کا
حساب ہی نہ تھا، ہاں اگر یہاں اِتنا کام کرتی تو
خدا جھوٹ نہ بلائے میرے لیکھے ہاتھ پر ایک
سال سے کم نہ لگتا۔

اس عرصے میں ساری پریاں خاص کر شہزادی
مجھ سے بہت محبت کرنے لگی تھی، خالہ سیدانی خالہ
سیدانی کہتے کہتے اُس کا مُنہ سوکھتا تھا، گھنٹوں
میرے پاس بیٹھی رہتی، اور مجھ کو سوئی چلاتے
دیکھا کرتی، تم جانو پاس رہنے کا بڑا اثر ہوتا
ہے، مجھے بھی اُس کی بھولی بھالی شکل پر پیار آتا
تھا، مگر دِل کو کیا کرتی، یہ مگوڑا تو یہاں پڑا ہُوا

تھا۔ گھر کی یاد چین نہیں لینے دیتی تھی، ہاں
اپنا کھنڈلا پرستان میں کبھی نہیں بھولا۔

آخر جب سارا کام اُن کی مرضی کے موافق ہو گیا
تو میں نے کہا: "حضور خدا نے مجھے سُرخ رو کیا
مولا علیؑ نے میری آبرو رکھ لی۔ سرکار کو شہزادی
کی شادی اور شہزادی کو یہ جوڑے پہننے مبارک ہوں
اب لونڈی کو رُخصت کیجیے"

بادشاہ بیگم بولیں، "سیدانی بی! ہمارا جی
چاہتا ہے کہ شہزادی کی شادی دیکھ کر جاؤ"

سچ کہوں میرا بھی جی بھر بھر آیا، مگر سوچا کہ
سیدانی دیوانی ہوئی ہے تو خاکی اور یہ آتشی، زیادہ
میل جول اچھا نہیں، ذرا سی دیر میں بگڑ بیٹھیں تو
جلا کر خاک کر دیں۔ بھاڑ میں جائے پرستان، اور

پرستان کی شادی چل اپنے گھر چل۔

ہاتھ جوڑ کر عرض کیا " شہزادی کی شادی آپ کو جم جم نصیب ہو، مجھے تو جانے ہی دیجئے"۔

یہ سن کر شہزادی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے وہ بولی: سیدانی بی! تم کیوں جاتی ہو؟ ہمارا دل کڑھتا ہے، نہ جاؤ یہیں رہو"

میرے کلیجے پر چوٹ سی لگی، بڑی مشکل سے اپنے کو سنبھال کر بولی: سیدانی تم پرواری، بیوی تم اپنا جی بھاری نہ کرو۔ تم بلاؤ گی تو سو دفعہ آؤں گی، اکیلا اکیلی دنیا چھوٹ نہیں سکتی بس مٹی میں خوش رہتی ہے۔

شہزادی تو کچھ خفا اور کچھ رنجیدہ سی ہو کر اٹھ گئیں تم بادشاہ بیگم بولیں۔" اچھا بی سیدانی تمہاری مرضی جاؤ خدا حافظ۔ اور اس کلموئے بڑے گدھے کو حکم دیا کہ سیدانی کو

ان کے گھر پہنچا دے، خبردار جو رستے میں کسی طرح شرارت کی ہو اور دیکھیو جو انعام اکرام سیدانی بی کو بادشاہ نے دیا ہے وہ سب پالکی میں رکھ دینا۔

دِل میں خوش اور ظاہر میں بسورتی ہُوئی سب سے رُخصت ہُوئی، وہی پری زاد جو مجھے پالکی سے اُتار کر لائی تھی ساتھ لے کر چلی، پھاٹک کے باہر پالکی موجود تھی اور مردِ موئوں کی سی وضع کا آدمی پاس کھڑا تھا۔ میں پالکی میں بیٹھی اور دم کے دم میں پالکی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

پالکی میں بیٹھ کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ وہ جو پرستان کے بادشاہ نے انعام و اکرام دیا ہے کہاں ہے، اندھیرے میں کیا نظر آتا، ہاتھوں سے ٹٹولنا شروع کیا۔ ایک کونے میں بہت سے کنکر پتھر معلوم ہوئے! جل گئی کہ موئے جنات تھے نا، یہاں بھی دغا کی، یہ ان کے گھر کا انعام و اکرام ہے

خیر جان بچی لاکھوں پائے، خیریت سے گھر پہنچ جاؤں تو جانوں کہ بڑا انعام پایا اور میں نے چپکے چپکے ایک ایک کرکے وہ کنکر پتھر پردے کی جِھبری میں سے پھینکنے شروع کر دئیے۔ قاعدہ ہی کہ خوشی میں رستہ جلدی کٹ جاتا ہی آنکھ بند کرنے میں گھر آگیا۔ ڈیوڑھی میں پالکی رکھی گئی، چراغ جل رہا تھا، پردہ جو اُٹھا اور چراغ کی جوت جو پڑی تو کیا دیکھتی ہوں کہ جنھیں میں کنکر پتھر سمجھ رہی تھی، جواہرات ہیں۔ بڑے بڑے تو میں نے سب پھینک دئیے تھے، دو چار ننّھے ننّھے سے باقی تھے، سر پیٹ لیا کہ اتنی دولت کھوئی نگوڑی پھینکنے کی کیا ضرورت تھی، اتنا ہی تھا تو گھر آکر پھینک دیتی لیکن بہن تقدیر کی کھوٹ کہاں جاتی ہی، نصیب میں تو پتھر بھی نہ تھے ہیرے لال زمرد کیوں ملتے، ایک ایک پیڑ من من بھر کا ہو گیا، صرف

چار نکلنے رہ گئے تھے وہی نے کر بڑی مشکل سے اُتری۔

گھر میں جو پہنچی تو بونٹ پلاؤ جیسا چھوڑ گئی تھی ویسا ہی دَم پر لگا ہوا تھا، بڑی بی پکانے والی مغرب کی نماز پڑھ کر دُعا مانگ رہی تھیں، دُعا مانگ چکیں تو اُنھوں نے پوچھا: بیگم کیا رستے میں سے اُلٹی آگئیں، خیر تو ہے؟

میں نے دِل میں کہا: "لیجئے یک نہ شد دو شد" پرستان میں خدا معلوم کتنے مہینے لگ گئے اور یہاں ابھی چاولوں کو دم بھی نہیں آیا! اور بڑی بی سے بولی: ہاں بی بھوک لگی ہوئی تھی اور کچھ جی بھی ٹھیک نہ تھا، رستے ہی میں سے آگئی۔ اب انشاءاللہ کل جاؤں گی۔

ختم

دوسری بار (۱۰۰۰)

مطبع ہمدرد دہلی

ناشر

بچوں کا بک ڈپو دہلی

۳ مچر ستراں کلاں محل

Bachchon Ka Kutab Khana
Moh. Thana Tla
Rampur U.P.

دارالکتاب تاجران کتب بازار نصراللہ خاں رامپور